ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.3 (2026)
(July to September)

تفاعلاتِ بے خودی: علامہ اقبال کا نظریاتی فرد اور اجتماعی عروج کا تصور

Dynamics of Bekhudi: Allama Iqbal's Concept of Individual Ideology and Collective Advancement

ڈاکٹر سید شیراز علی زیدی
اسسٹنٹ پروفیسر، انچارج شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

Dr. Syed Shiraz Ali Zaidi
Assistant Professor / In-Charge, Department of Iqbal Studies, Allama Iqbal Open University, Islamabad
Shiraz.ali@aiou.edu.pk

Abstract: This article analyzes Allama Iqbal's philosophy of Bekhudi (selflessness) as the ultimate mechanism for individual and communal development. While Khudi discovers the inner self, it can only attain perfection by surrendering personal desires to the collective Muslim community (Millat) through Bekhudi. Based on Iqbal's Rumoz-e-Bekhudi, the author emphasizes that the individual and the community serve as mutual mirrors, where individual identity expands into a vast ocean of social existence. The research highlights how Bekhudi is structured through strict obedience to Islamic laws, self-control (Zabt-e-Nafs), and spiritual pillars like Namaz and Zakat. Historical examples including the battlefield harmony under Abu Ubaidah, Sultan Murad's submission to legal equality, and Imam Hussain's ultimate sacrifice at Karbala are examined to prove that true freedom and communal honor are born when the self dissolves into the divine purpose of the nation.

Key words: Iqbal's philosophy, personal desires, mutual mirrors, spiritual pillars, Karbala, Imam Hussain's ultimate, communal honor

بے خودی خودی ہی کے ذریعے اپنی نشو و نما کرتی ہے۔ علامہ کے خیال میں فرد کے لیے ضروری ہے کہ اول وہ اپنی ذات میں غوطہ زن ہو کر اپنی خودی کو دریافت کرے اور اول جماعت میں رہ کر اس کے فیوض و برکات سے خودی کی تربیت کرے تاکہ اس کی خودی کمال حاصل کر کے جماعت کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکے۔ اقبال نے خودی کی تربیت کے جو مراحل بیان کیے ہیں۔ اس میں جماعتِ مسلمین کے قوانین و قواعد کو پیش نظر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبال اول و آخر مسلمان تھے اور پھر جس جماعت کے افراد کی تربیت ان کے پیش نظر تھی، ان کے لیے اسلامی قوانین ہی کو مدِ نظر رکھنا ضروری تھا، تاہم انھوں نے اسلامی قوانین کے فلسفیانہ مطالعہ کے بعد ان قوانین کو معاشرت سازی اور دنیاوی و اخروی بھلائی کے لیے بنی نوع انسان کے لیے بہترین اصول قرار دیا۔ بے خودی کے ذریعے پہلے خودی کی تربیت جماعت کے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے، پھر خودی استحکام کے بعد جماعت کے استحکام کے لیے کار گر ہو جاتی ہے فرد اور جماعت میں مضبوط رشتہ پیدا ہو جاتا ہے اور انفرادی خودی اجتماعی خودی تک وسعت اختیار کر کے ملی غیرت و حمیت کا باعث بن جاتی ہے۔

الف۔ خودی کی تربیت:

انسان کی خودی خود بہ خود بے دار نہیں ہوتی۔ اس کے لیے انسان کو کچھ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جو جماعت یا اجتماعی خودی اس کے لیے طے کرتی ہے۔ اقبال نے تربیت کے تین مرحلوں کی تخصیص کی ہے جنھیں وہ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کا نام دیتے ہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ اطاعت کا ہے۔ اس سے مراد اس آئین کی پابندی ہے جس کی حدود میں انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اس ضمن میں اقبال نے اونٹ کو بطور مثال پیش کیا ہے جس کا شیوہ خدمت اور محبت ہے۔ وہ اپنے اس آئین کا پابند ہے اور سفر میں بھی اپنے سوار سے زیادہ صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا اپنے آئین کی سختی سے پابندی کرنا خودی کے استحکام کے لیے پہلی شرط ہے:

تو ہم اے بارِ فرائض سر متاب		برخوری از عندہ حسن المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار		می شود از جبر پید اختیار (۱)

ترجمہ:

۱۔ تو بھی ذمے داریوں سے منھ نہ موڑ تاکہ تو عندہ حسن المآب کا پھل پائے۔

۲۔ اے غفلت کے عادی انسان تو اطاعتِ خداوندی کی کوشش کر، جبر ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے

اقبال مسلمانوں کو قرآن سے رجوع کرنے کی دعوت اور اس کے احکام کی سختی کا شکوہ کرنے کی بجائے اس کی حدود سے تجاوز نہ کرنے کا درس دیتے ہیں:

باز اے آزادِ دستورِ قدیم		زینتِ پا کن ہما زنجیرِ سیم
شکوہِ سنجِ سختیِ آئیں مشو		از حدودِ مصطفاؐ بیروں مشو (۲)

ترجمہ:

۱۔ اے پرانے آئین و دستور سے بے تعلق تو پھر سے وہی چاندی کی زنجیر پاؤں میں ڈال لے۔

۲۔ آئین کی سختی کا گلہ شکوہ نہ کر، نبی کریمؐ کے مقرر کردہ آئین و دستور کے دائرے سے باہر نہ نکل۔

"دستورِ قدیم" سے اسلام کا وہ قدیم نظام مراد ہے جس کا آغاز صدیوں پہلے ہوا۔ مسلمان جب اس دستور پر عمل پیرا اور کاربند ہوئے تو انھوں نے ہر میدان میں کامیابیاں حاصل کیں مگر جب اس دستور سے غفلت برتی تو زوال و پستی کا شکار ہو گئے۔ علامہ اس دستورِ کہن کو چاندی کی زنجیر کہہ کر دوبارہ پاؤں میں ڈالنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر ملتِ اسلامیہ کو اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنا ہے تو انھیں اسلامی شریعت پر پوری طرح کاربند رہنا ہو گا۔ کیوں کہ یہ آئین ملتِ اسلامیہ کی فلاح و بقا کا ضامن ہے۔ اس کی سختی کا شکوہ کرنا نادانی ہے۔ دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس کا ہے۔ "ضبطِ نفس" سے مراد سفلی خواہشات اور ذاتی اغراض پر قابو پانا ہے کیوں کہ انسانی نفس میں خیر اور شر دونوں پہلو موجود ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ نفس کو شر سے مغلوب ہونے سے بچایا جائے۔ یہاں بھی اقبال نے اونٹ کی مثال پیش کی ہے جو کہ خود سر، خود پرست اور خود پرور ہے۔ نفسِ انسانی بھی اسی طرح سرکش، خود پرست اور خود پرور ہوتا ہے، دوسروں کا استحصال کرتا ہے، دوسروں کا مالک و مختار بننے کی کوشش کرتا ہے یا پھر ان کا غلام بن جاتا ہے:

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است		خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو، آور زمامِ او بکف		تا شوی گوہر اگر باشی خذف

ہر کہ بر خود نیست فرمانش روا		می شود فرماں پذیرِ دیگراں (۳)

ترجمہ:

۱۔ تیرا نفس اونٹ کی طرح اپنی پرورش کرنے والا ہے۔ وہ خود پسند، اپنا سوار آپ، ضدی اور سرکش ہے۔

۲۔ تو مرد بن اور اس کی لگام ہاتھ میں تھام لے تاکہ اگر تو ٹھیکری ہے تو گوہر بن جائے۔

۳۔ جس کا بھی اپنے نفس پر حکم نہیں چلتا وہ دوسروں کا حکم بجالانے میں لگا رہتا ہے۔

اس سرکش نفس کو نکیل ڈالنے کے لیے اقبال نے پانچ اصول پیش کیے ہیں جو کہ اپنے اندر معاشرتی اصلاح کا مکمل نظام رکھتے ہیں۔ یہ اصول کلمہ طیبہ یعنی توحید و رسالت، نماز، روزہ، حج اور ذکواۃ ہیں۔ آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے توحید کے نور سے اپنے قلب کو منور کرے اور حضور اکرمؐ کی رسالت پر ایمان لائے۔ توحید پر ایمان انسان کو یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ دنیا میں بے مقصد اور مادر پدر آزاد نہیں ہے۔ بل کہ وہ ہر لمحے خدا کی نگرانی میں ہے۔ اسے اپنے ہر عمل کا جواب دہ ہونا ہے اور رسالت اس میں ایک ایسے آئین کا شعور بے دار کرتی ہے جس کے تحت اسے اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ اس کے بعد نماز کی باری آتی ہے۔ نماز خدا سے براہِ راست تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ جب حضورِ قلب سے ادی کی جائے تو بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔ اس کی مثال ایک خنجر کی سی ہے، جیسے خنجر کا کام کاٹنا ہے، اسی طرح نماز بھی برائیوں کو جڑ سے اٹھا کر پھینک دیتی ہے:

لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز		قلبِ مسلم را حجِ اکبر نماز
در کفِ مسلم مثالِ خنجر است		قاتلِ فحشا و بغیِ منکر است (۴)

ترجمہ:

۱۔ لا الٰہ سیپی ہے تو نماز گوہر ہے۔ مسلمان کے لیے نماز حجِ اصغر کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ یہ (نماز) مسلمان کے ہاتھ میں خنجر کی مانند ہے۔ یہ بری اور بے حیائی کی باتوں، خدائی احکام کی نافرمانی اور برے کاموں کو مٹا دینے والی ہے۔

کلمہ و نماز کے بعد تیسرا اہم اصول روزہ ہے۔ روزے میں یہ خاصیت ہے کہ یہ آدمی کو دنیا کی بے جا خواہشات و شہوات سے محفوظ رکھتا ہے۔ انسان عام دنوں میں بھوک پیاس برداشت نہیں کر تا لیکن جب اس نے روزہ کر رکھا ہو تو باوجود اختیار کے کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ اس میں اتنی روحانی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ شکم پروری پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اقبال نے تن پروری کو خیبر سے تشبیہ دی ہے کیوں کہ سفلی خواہشات پر قابو پانا بہت مشکل کام ہے لیکن روزہ انسان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے جس کی بدولت وہ ان پر آسانی سے قابو پالیتا ہے:

روزہ بر جوع و عطش شب خوں زند		خیبرِ تن پروری را بشکند (۵)

ترجمہ:

روزہ بھوک اور پیاس پر شب خون مارتا ہے۔ وہ (روزہ) صرف بدن کی پرورش کرنے والے خیبر کو فتح کرتا ہے۔

چوتھا اصول "حج" کا ہے۔ حج کے موقعے پر دنیا کے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنی یک جہتی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے وہاں تک آتے ہیں۔ اپنے وطن سے مکہ کی سرزمین پر پہنچنا گویا ایک طرح سے ہجرت ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان وہاں پہنچ کر صرف مسلمان ہوتے ہیں۔ سب اکٹھے طواف کرتے ہیں۔ عربی، عجمی، کالے گورے، امیر اور غریب کی تفریق ختم

ہو جاتی ہے۔ تمام مسلمان باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی نسل پرستی یا جغرافیائی حدود سے وابستگی ختم ہو جاتی ہے۔ تمام مسلمان بس ایک ملتِ مسلمہ ہوتے ہیں:

مومناں را فطرت افروز است حج		ہجرت آموز و وطن سوز است حج
طاعتے سرمایہء جمعیتے		ربطِ اوراقِ کتابِ ملتے (۶)

ترجمہ:

۱۔ حج مومنوں کی فطرت منور کرنے والا ہے یعنی ان کے ایمان میں اضافہ کرنے والا ہے۔ حج ہجرت سکھانے والا اور جغرافیائی حدود کو جلا دینے والا ہے۔

2۔ وہ (حج) ایک ایسی عبادت ہے جو (پوری ملتِ اسلامیہ کو) ایک لڑی میں پرو دینے والی اور ملت کی کتاب کی شیرازہ بندی کرنے والی کتاب ہے۔ انچواں اصول "زکواۃ" ہے۔ زکواۃ مال و دولت کی محبت کو مٹانے والی ہے۔ صاحبِ نصاب جب اپنے مال سے ذکات نکالتا ہے تو وہ ہنسی خوشی اپنے مال سے محتاجوں اور ضرورت مندوں کا حصہ دیتا ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ وہ مال پر سانپ بن کر نہیں بیٹھا بل کہ اس کی دولت پر ان لوگوں کا بھی پورا حق ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے محروم رہ گئے ہیں۔ پسماندہ لوگوں میں جب مال تقسیم کیا جاتا ہے تو انھیں خوش حالی نصیب ہوتی ہے اور معاشرے کی اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے لیکن اس سے مال دار کا مال گھٹتا نہیں بل کہ بڑھتا ہے کیوں کہ جتنی رقم وہ ضرورت مندوں کے لیے نکالتا ہے، اللہ اس کے بدلے اس کے مال میں برکت عطا فرماتا ہے اور اس کا مال بڑھ جاتا ہے:

حبِ دولت را فنا سازد زکواۃ		ہم مساوات آشنا سازد زکواۃ
دل زحبلّ تنفقو محکم کند		زر فزاید الفتِ زر کم کند (۷)

ترجمہ:

۱۔ زکواۃ مال و دولت کی محبت کو دل سے مٹا دیتی ہے۔ زکواۃ (ملت کے افراد کو) برابری سے بے آگاہ کرتی ہے۔

۲۔ یہ زکواۃ "حتّٰی تنفقو" کے ارشاد باری تعالیٰ سے دل کو مضبوط بناتی ہے، دولت کو برکت عطا کرتی ہے اور دولت کی محبت کو کم کرتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں یہ تمام اصول اپنانے کے بعد انسان کسی بھی مقام پر شکست نہیں کھائے گا۔ ان ارکان پر عمل پیرا ہونے کے سبب اس کا دل مضبوط ہو گا اور وہ صاحبِ عزم و ہمت بن جائے گا۔ پھر نہ تو وہ سام راج کی غلامی قبول کرنے پر تیار ہو گا اور نہ ہی تقدیر کا جبر برداشت کرے گا۔

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تست		پختہء محکم اگر اسلامِ تست (۸)

ترجمہ:

یہ سب ارکان تیری قوت و استحکام کا سامان ہیں۔ اگر تیرا اسلام مضبوط ہے تو تو بھی مضبوط ہے۔

ب۔ جماعت کا استحکام:

جب انسان اطاعت اور ضبطِ نفس کے مراحل طے کر لیتا ہے تو اس کے بعد وہ مرحلہ آتا ہے جب انسان خود کو نیابتِ الٰہی کا حق دار ثابت کرنے کے لیے جدوجہد کی راہ اپنا لیتا ہے۔ اس دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتا ہے۔ ہر ناقص کو کمال کے درجے تک پہنچا دیتا ہے اور تقدیر کے شکوے کرنے کی بجائے اپنی ہمت سے اپنا جہان خود پیدا کرتا ہے:

خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند		ایں بساطِ کہنہ را برہم زند
فطرتش معمور و می خواہد نمود		عالمے دیگر بیارد در وجود
صد جہاں مثلِ جہانِ جزو کل		روید از کشتِ خیالِ او چو گل
پختہ سازد فطرتِ ہر خام را		از حرم بیروں کند اصنام را
شیبِ را آموزد آہنگِ شباب		می دہد ہر چیز را رنگِ شباب
نوعِ انسان را بشیر و ہم نذیر		ہم سپاہی، ہم سپہ گر ہم امیر (۹)

ترجمہ:

۱۔ جب وہ کائنات کی وسعتوں میں خیمہ لگاتا ہے تو اس کی پرانی بساط کو الٹ کے رکھ دیتا ہے۔

۲۔ اس کی فطرت (حق و صداقت کے خزینوں سے) بھری ہوتی ہے اور اس کا اظہار وہ ایک نئی دنیا کو وجود میں لانے کے لیے کرنا چاہتی ہے۔

۳۔ اس کائنات جیسے سینکڑوں عالم اس کی فکری کھیتی سے پھول کی صورت پیدا ہوتے ہیں۔

۴۔ وہ ہر ناقص کی فطرت کو کمال تک پہچاتا ہے۔ حرم سے بتوں کو باہر نکال پھینکتا ہے۔

۵۔ وہ پیری کو جوانی کی لے سکھاتا ہے اور ہر چیز کو شباب کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

۶۔ وہ بنی نوع انسان کے لیے خوش خبری دینے والا بھی ہے اور اسے ڈرانے والا سپاہی بھی ہے، فوج کا سپہ سالار بھی اور سردار بھی۔

درج بالا اشعار سے خوب اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انفرادی خودی تربیت کے بعد استحکام حاصل کر کے نیابت الٰہی کے منصب پر فائز ہو جاتی ہے۔ قوم چوں کہ افراد ہی کے مجموعے کے نام ہے۔ اس لیے فرد کا مضبوط ہونا دراصل قوم ہی کا مضبوط اور پائیدار ہونا ہے۔ انفرادی طور پر استحکام فرد کو راغب کرتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اس جماعت کے لیے وقف کر دے جس نے اس کی تربیت سازی کی ہے۔ لہٰذا اب وہ کار جہاں بینی انجام دیتا ہے دنیا و مافیہا کے متعلق اس کا نکتہ نظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کی انفرادی صلاحیتیں قوم کی بقا اور استحکام کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔ وہ بیک وقت قوم کا رہ نما بھی ہوتا ہے خادم بھی۔ وہ بشیر بھی ہوتا ہے اور نذیر بھی، سپہ گری کے فرائض بھی انجام دیتا ہے اور سردار بن کے قوم کی تقدیر سازی بھی کرتا ہے، مستقبل کے منصوبے بھی بناتا ہے اور ماضی سے سبق بھی حاصل کرتا ہے۔ غرض یہ کہ انفرادی استحکام اجتماعی استحکام کا باعث بن جاتا ہے اور فرد اور جماعت کے باہمی اشتراک اور تعاون سے ایک مستحکم معاشرہ قائم ہوتا ہے۔

ج۔ فرد اور جماعت میں ربط:

اقبال نے خودی کا جو تصور پیش کیا تھا اس سے قوم میں ایک ہیجان برپا ہو گیا تھا۔ اردو تو کیا فارسی میں بھی اس کا وہ مفہوم مستعمل نہیں تھا جو علامہ نے پیش کیا تھا۔ انھوں نے فرد کی بہت زیادہ اہمیت اور اس کے ذاتی جوہر کی لا محدود استعداد پر زور دیا تو اس سے انسانی انا یا خودی کی حقیقت ایک نئے خیال انگیز اور انقلابی رنگ میں سامنے آئی لیکن اس میں فرد اور ملت کے باہمی ربط اور حقوق و

وظائف کی وضاحت نہیں ہوتی تھی اور انسان کی انفرادی عظمت اور خودی کی قوتِ تخلیق و تسخیر پر جو زور دیا گیا تھا، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی کہ انفرادی خودی پر اس قدر اسرار اجتماعی خودی کا شیرازہ بکھیر دے گا۔ اقبال نے اس کی وضاحت کے لیے "رموزِ بے خودی" کی تخلیق کی اور یہ غلط فہمی دور کر دی۔ اس میں اقبال نے فرد اور ملت کے باہمی ربط کی منطقی انداز میں صراحت کی ہے جس سے فلسفہ خودی اور بے خودی کے درمیان مکمل ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ جس طرح اقبال نے خودی کے لفظ کو ایک نیا معانی و مفہوم دیا بالکل اسی طرح بے خودی کو بھی ایک نئے معانی سے آراستہ کر کے پیش کیا۔ اگر خودی سے علالمہ کی مراد اثبات و تعینِ ذات ہے تو بے خودی سے مراد فرد کا جماعت کے لیے وقف ہو جانا ہے۔ فرد جماعت کی محبت میں جس میں اس کی پرورش و پرداخت ہوئی ہے اپنے اختیارات سے خود دست بردار ہو جاتا ہے:

در جماعت خود شکن گردد خودی		تا زگل برگے چمن گردد خودی (۱۰)

ترجمہ: جماعت میں خودی اپنے آپ سے دست بردار ہو جاتی ہے گویا وہ پھول بن کر چمن کا حصہ بن جاتی ہے۔

یہاں اقبال نے خودی اور بے خودی کے باہمی ربط کو اپنے فلسفہ کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا ہے۔ "رموزِ بے خودی" کی تمہید ہی میں علامہ نے فرد و ملت کے باہمی ربط کو موضوعِ بحث بنایا ہے اور ایک دوسرے کے لیے دونوں کی اہمیت واضح کی ہے۔ علامہ کا فرمانا ہے کہ فرد کے لیے جماعت سے رابطہ رحمت ہے اور اس کے خودی کے جوہر کی تکمیل ملت ہی کے حوالے سے ہوتی ہے۔ فرد و جماعت کی حیثیت ایک دوسرے کے لیے آئینے کی سی ہے۔ اگر فرد کی عزت و عظمت کا انحصار ملت پر ہے تو ملت کو بھی اپنی تشکیل اور نظم و ضبط کے لیے افراد کی احتیاج ہے۔ فرد کا جماعت میں گم ہو جانے کا مطلب ہے کہ قطرہ فنا ہونے کی بجائے سمندر کی صورت میں اپنے امکانات کو وسیع کر لیتا ہے۔ فرد کا قول و فعل ملت کا قول و فعل بن جاتا ہے گویا فرد خود ملت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تنہا فرد اپنے زندگی کے مقاصد کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور اس کی قوت کے منتشر ہو جانے کا خطرہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے لیکن جماعت فرد کو نظم وضبط کا پابند بناتی ہے اور ایک دستور و آئین کے ذریعے اسے پابند کر کے گویا حقیقی آزادی سے ہم کنار کرتی ہے۔ اقبال نے "شذرات" میں تحریر کیا ہے:

> "ہماری قومیت محض ایک تصور ہے جس کی کوئی مادی بنیاد نہیں۔ حیات و کائنات کے ایک خاص نظریے کے بارے میں ایک طرح کا ذہنی سمجھوتا ہی ہمارا واحد نقطہء اجتماع ہے" (۱۱)

چوں کہ مسلم قومیت کی بنیاد مادی نہیں بل کہ روحانی اور ذہنی سمجھوتے پر ہے اس لیے فرد جماعت کے مفادات کو اپنے ذاتی فائدے پر بخوشی ترجیح دیتا ہے۔ ملت کا فرد ہونے کا ناطے وہ دوسرے افراد سے اپنے روابط کو مضبوط بناتا ہے۔ ملت کے افراد کے لیے ایثار اور قربانی کا جذبہ اس کی شخصیت میں فطری طور پر موجزن ہو جاتا ہے۔ اقبال نے شذرات ہی میں عصبیت کے سلسلے میں وضاحت کی ہے کہ مسلمانوں پر عصبیت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن یہ عصبیت حق بجانب ہے کیوں کہ حیاتیات کی زبان میں عصبیت اس کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے کہ اصولِ فردیت بجائے فردِ واحد کے ایک جماعت پر عمل کرتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو زندگی کی تمام صورتیں ہی معتصبانہ ہوتی ہیں اور اگر انھیں اپنے اجتماعی وجود کی فکر ہے تو انھیں ایسا ہونا بھی چاہیے۔ علامہ اس کی مثال پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی انگریز کے مذہب پر تنقید کریں تو اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا لیکن اس کی تہذیب، ملک، عملی سرگرمیوں یا قومی شعار پر نکتہ چینی کی جائے تو اس کا اندرونی تعصب ظاہر ہو جائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی قومیت کی بنیاد مذہب پر نہیں ہے، بل

کہ جغرافیائی حدود یا وطن پر ہے۔ چناں چہ جیسے ہی اس کے وطن پر تنقید کی جاتی ہے تو اس کی عصبیت کا جذبہ بجا طور پر بھڑک جاتا ہے۔ مسلمانوں کی حقیقت اس کے بل کل برعکس ہے کیوں کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے لہٰذا جیسے ہی مذہب پر تنقید کی جاتی ہے تو ہماری قومیت کا جذبہ کار فرما ہو جاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں احساس کی نوعیت ایک جیسی ہے، اگرچہ اس کا تعلق مختلف چیزوں سے ہے "عصبیت دینی وطن پرستی ہے، اور وطن پرستی ملکی عصبیت۔"(۱۲)

اقبال نے "رموزِ بے خودی کی "تمہید" میں "ربطِ فرد و ملت" کا مفہوم بیان کیا ہے۔ اس میں جماعت کے ساتھ ربط کو ملت کے لیے رحمت قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فرد کی خودی کا جوہر ملت کے ساتھ مربوط ہو کر ہی اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ اس حصے میں فرد اور ملت کی باہمی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور فکر انگیز نکتے پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں خودی اور خدا کے رشتے کی وضاحت کر کے ملت کی خودی کا ایک آفاقی و عملی تناظر قائم کیا گیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

فردو وقوم آئینہء یک دیگر اند		سلک و گوہر، کہکشاں از ملت است
فرد تا اندر جماعت گم شود		قطرہء وسعت طلب قلزم شود
وصل استقبال و ماضی ذاتِ او		چوں ابد لا انتہا اوقاتِ او
فرد تنہا از مقاصد غافل است		قوتش آشفتگی را مائل است
قوم با ضبط آشنا گرد اندش		نرم رو مثلِ صبا گرداندش
در جماعت خود شکن گردد خودی		تازگل برگے چمن گردد خودی (۱۳)

ترجمہ:

۱۔ فرد و قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں، ان کا رشتہ سلک و گوہر اور کہکشاں و اختر کا ہے۔

۲۔ فرد جب جماعت سے پیوستہ ہو جاتا ہے تو گویا قطرہ پھیل کر سمندر بن جاتا ہے۔

۳۔ حال کے ساتھ، ماضی اور مستقبل بھی فرد کی شخصیت کے حصے ہیں اور اسی جامعیت کے باعث اس کے اوقات لامتناہی ہیں۔

۴۔ تنہا فرد مقاصد سے غافل ہوتا ہے اور اس کی قوت پراگندگی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

۵۔ قوم اسے نظم وضبط سے آشنا کرتی ہے اور اس میں صبا و نسیم جیسی لطافت پیدا کر دیتی ہے۔

۶۔ خودی جماعت کے اندر رہ کر خود شکن ہوتی ہے اور ایک برگِ گل سے پورا گلستان پیدا کرتی ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم اقبال کے نکتہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ افراد پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن جماعت کا وجود باقی رہتا ہے۔ کسی فرد میں ترقی کی خواہش بھی قومی جذبے ہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے اور خیر و شر کا تعین بھی جماعت سے ہوتا ہے۔ انسان اگرچہ حیوانِ ناطق ہے لیکن وہ جماعت کے بغیر ناطق نہیں ہو سکتا۔ جیسے کہ زبان جو انسانوں کے ہزاروں سالوں کا نچوڑ ہے کسی ایک فرد کی بنائی ہوئی نہیں بل کہ جماعت سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے افراد کے ساتھ مل کر ایک فرد ملت کی وسعت حاصل کر لیتا ہے اور دوسری طرف افراد کی کثرت بھی ایک طرح کی وحدت بن جاتی ہے۔ اگر الفاظ کو دیکھا جائے تو وہ دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر ہی جملے کی صورت اختیار کرتے ہیں۔(۱۴) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرد کا جماعت کے ساتھ ربط انفرادیت کی فنا کا باعث نہیں بل کہ اس کی انفرادیت کو مہمیز کرتا اور ایک نئی بامقصد جہت عطا کرتا ہے۔

د۔ فرد میں قومی حریت وحمیت کی بے داری:

"رموزِ بے خودی" میں اقبال نے ایک عنوان "در معنی این کہ مقصودِ رسالت محمدیہ تشکیل و تاسیسِ حریت و مساوات و اخوت بنی نوع آدم است" قائم کیا ہے۔ فرد جب جماعت کے ساتھ ربط قائم کرتا ہے اور جماعت کے مقاصد کو اپنے مقاصد اور جماعت کے فائدے کو اپنے فائدے سمجھتا ہے تو اس کی خودی میں حریت و حمیت قومی بیدار ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اس عنوان کے تحت یہ وضاحت کی ہے کہ اسلام کا پیغام تمام بنی نوع انسان کے لیے حریت، حمیت، غیرت اور مساوات کا ہے۔ اسلام کی تعلیمات نے ایک ایسی معاشرت، معیشت اور سیاست کا نظام دیا ہے اس کی وجہ سے تمام انسانوں کی گردنوں سے غلامی کا طوق اتر گیا ہے۔ پہلے انسان انسانوں کی سامنے جھکتے تھے، قرآن کریم کی تعلیمات نے خدائے احد اور لا قیصر و کسریٰ کا اعلان کر دیا۔ پہلے سلطان، امیر، کاہن، پاپا سب مل کر انسانوں کا استحصال کرتے تھے، مذہب بھی انسانیت دشمنوں کے آلہ کار کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اسلام نے انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلا کر اسے ایک خدا کے سامنے سر بسجود کر دیا۔ اس طرح اس کی گردن سے غلامی کا طوق اتر گیا اور وہ ایک خدا کا غلام بن کر تمام دنیاوی آقاؤں سے نجات پا گیا۔ فرد میں جماعت کے توسط سے حمیت اور غیرت کا احساس پیدا ہوا۔ حریت نے اس میں حمیت کو جنم دیا اور یہ حریت و حمیت جماعت کے نظام سے تربیت پا کر انفرادی اور اجتماعی طور پر جماعت تک وسعت اختیار کر گئی۔ فرد کی انفرادی حریت و غیرت اور حمیت قوم کی حریت اور غیرت و حمیت بن گئی۔ فرد نے اپنی قومی غیرت کی بقا کے لیے ایثار کو اختیار کیا اور اس طرح اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بقا کا ضامن بن گیا۔

فرد کی یہ حریت اور حمیت جماعت ہی کی مرہون منت ہے۔ جیسے کہ گزشتہ سطور میں بیان ہوا کہ اسلام سے قبل دنیا کا یہ نقشہ بن چکا تھا کہ انسان اپنے جیسے انسانوں کے سامنے سر بسجود تھا۔ لیکن اسلامی تعلیمات کی برکت سے مسلمان نے ہر قسم کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر پھینک دیا۔ اس میں اپنی شخصیت کے اہم ہونے کا احساس اجاگر ہوا۔ اس کو معلوم ہوا کہ وہ براہ راست خدا سے مخاطب ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے اسے کسی قسم کے ذریعے یا سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی حاجات اپنے معبود کے سامنے پیش کر سکتا ہے، اس سے مدد مانگ سکتا ہے، اس سے نفسیاتی طور پر بھی اسے بحیثیت انسان اپنی قدر و منزلت کا احساس ہوا اور اس میں غیرت و حمیت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اب اس کی نظروں میں بادشاہوں کی کوئی اہمیت رہی، نہ ہی دنیاوی اشیا کی لالچ اور حرص، جس جس نے بھی اپنا رابطہ جماعت کے ساتھ استوار کیا، اس میں یہ صلاحیتیں اجاگر ہونے لگیں۔ رسول کریم ﷺ نے اصحاب رضوان اللہ علیہم کی تربیت جماعت کے انھی اصولوں پر کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے دنیا جہان کو اپنی فقیری کے سامنے سرنگوں کر لیا۔ ایک دور دراز کے غیر مہذب صحرائی علاقے کے باشندوں نے جماعت کے اصولوں سے اپنی تہذیب کر کے دنیا پر اپنی دھاک بٹھا دی۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ فرد کی انفرادی غیرت و حمیت بھی اس کی جماعت ہی کی مرہون منت ہے۔

اقبال نے "رموزِ خودی" میں کچھ مثالیں بیان کی ہیں۔ ایرانیوں کے خلاف جنگ میں جو ابو عبیدہؓ کی سپہ سالاری میں لڑی گئی۔ ان کا سپہ سالار جابان گرفتار ہو گیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں کون ہوں اور اسلامی فوج کے ایک عام سے سپاہی سے امان طلب کر لی۔ اس نے امان دی اور وعدہ کر لیا کہ تمھیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو پتہ چلا کہ جنگ کا اصلی مجرم تو وہی ہے۔ سب نے سپہ سالار سے کہا کہ اسے قتل کر دیا جائے لیکن ابو عبیدہ نے کہا کہ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ ایک کا وعدہ سب کا وعدہ ہے۔ امان دینے والا اگرچہ معمولی سپاہی ہے لیکن ہماری ملت کا فرد ہے۔ ہمیں اس کا پاس ہونا چاہیے۔ ملت کی یک آہنگی بڑے سے بڑے قاتل کے قتل کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے:

گفت: اے یاران مسلمانیم ما		تارِ چنگیم و یک آہنگیم ما

نعرہء حیدرؓ نوائے بوذرؓ است		گرچہ از حلقِ بلالؓ و قنبرؓ است
ہر یکے از ما امینِ ملت است		صلح و کینش صلح و کینِ ملت است(۱۵)

ترجمہ:

۱۔(سپہ سالار) فرمانے لگے: میرے دوستو ہم مسلمان ہیں۔ ہم ساز کے تار ہیں اور ہم سب کا آہنگ ایک ہی ہے۔

۲۔ حیدرؓ کا نعرہ اور ابوذرؓ ہی کی نوا ہے اگرچہ بلالؓ او قنبرؓ ہی کے حلق سے نکلی ہو۔

۳۔ ہم میں سے ہر ایک ملت کا امین ہے۔ اس (ملت کے فرد) کی صلح اور اس کی دشمنی ملت ہی صلح اور دشمنی ہے۔

دوسرا واقعہ سلطان مراد اور معمار کا ہے جسے مساوات کی مثال میں درج کیا گیا ہے۔ سلطان مراد نے ایک مشہور معمار کو ایک مسجد بنانے کا کہا لیکن جب مسجد بن کر تیار ہو گئی تو سلطان کو یہ مسجد پسند نہیں آئی۔ اس بات پر اس نے غصے ہو کر معمار کا ہاتھ کٹوا دیا۔ معمار قاضی کے پاس گیا اور اس سے انصاف کی فریاد کی۔ قاضی نے فوراً بادشاہ کو کٹہرے میں بلوالیا۔ سلطان نے جرم کا اعتراف کیا تو قاضی نے فیصلہ کیا کہ قرآن قصاص کا حکم دیتا ہے۔ قرآن کی نظر میں تمام مسلمان برابر ہیں اور بادشاہ کا خون معمار کے خون سے زیادہ رنگین نہیں ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

یک طرف فریادیِ دعوا گرے		یک طرف شاہنشہِ گردوں فرے
گفت شہ از کردہ خجلت بردہ ام		اعتراف از جرمِ خود آوردہ ام
گفت قاضی فی القصاص آمد حیات		زندگی گیرد باایں قانوں ثبات
عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست		خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست
چوں مراد ایں آیہء محکم شنید		دستِ خویش از آستیں بیروں کشید
مدعی را تابِ خاموشی نماند		آیہء بالعدلِ ولاحسان خواند
گفت از بہرِ خدا بخشیدمش		از برائے مصطفا ﷺ بخشیدمش
یافت مورے بر سلیمانے ظفر		سطوتِ آئینِ پیغمبر ﷺ نگر
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است		بوریا و مسندِ دیبا یکے است (۱۶)

ترجمہ:

۱۔ ایک طرف تو فریادی مدعی تھا اور دوسری طرف آسمان کی سی عظمت کا حامل شہنشاہ۔

۲۔ بادشاہ بولا: میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں۔ میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔

۳۔ قاضی نے کہا کہ قصاص میں حیات ہے۔ زندگی اسی قانون سے ثبات حاصل کرتی ہے۔

۴۔ جب (سلطان) مراد نے یہ محکم آیت سنی تو اس نے اپنا ہاتھ آستین سے باہر نکال لیا۔

۵۔ دعوا کرنے والے میں چپ رہنے کی تاب نہ رہی۔ اس نے بالعدل والاحسان والی آیت پڑھ دی۔

۶۔ کہا میں نے اسے (سلطان کو) خدا کی خاطر معاف کیا۔ میں نے اسے حضرت محمد مصطفا ﷺ کی خاطر بخش دیا۔

۷۔ ایک چیونٹی نے ایک سلیمان پر فتح پالی۔ پیغمبر ﷺ کی شرع کی شان دیکھو۔

۸۔ قرآن کریم میں غلام اور آقا برابر ہیں۔ بوریا اور دیبا کی مسند ایک جیسی ہیں۔

تیسرا واقعہ حریت کی مثال میں واقعہ کربلا سے کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ایک طرح عقل پر عشق کی فوقیت اور کامیابی کی بھی دلیل ہے۔ عشق کو سکون حمیت و حریت میں نظر آتا ہے۔ آزادی اور حمیت دینی کی خاطر یہ عشق ہی تھا جس نے امام حسین علیہ اسلام کو اصحاب و اہلِ بیتؑ کی بہت کم تعداد کے ساتھ یزید کے ہزاروں کے لشکر کے سامنے سینہ سپر کر دیا۔ اگر امام حسینؑ چاہتے تو یزید کی بیعت کر کے یا اس سے سمجھوتا کر کے عیش دنیا حاصل کر سکتے تھے مگر ان کی دینی حمیت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ امت کو ایک فاجر اور فاسق شخص کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔ یہ حریت اور حمیت شریعتِ اسلام ہی کی بخشی ہوئی تھی جس کی وجہ سے امام حسینؑ نے فرمایا کہ مجھ جیسا یزید جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا۔ امام حسینؑ کا یہ جملہ معروف ہے۔ اس جملے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ نے مجھ جیسا کہہ کر فرد کی بجائے جماعت کو مقدم رکھا اور تاقیامت ایک اصول پیش کر دیا کہ مسلمان فاسق اور فاجر کے سامنے کبھی سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ امام حسینؑ کی یہ لازوال قربانی حمیت دینی و حریت انفرادی و اجتماعی کا بہترین نمونہ ہے۔ اقبال نے "در معنیِ حریتِ اسلامیہ و سرِ حادثہء کربلا" کا عنوان "رموزِ بے خودی" میں قائم کیا ہے۔ اس عنوان کے تحت دیے گئے اشعار میں سے چند پیش کر کے اس باب کا خاتمہ کیا جاتا ہے:

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید		ایں دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوتِ شبیریؑ است		باطل آخر داغِ حسرت میری است
تا قیامت قطعِ استبداد کرد		موجِ خونِ او چمن ایجاد کرد
بہرِ حق در خاک و خون غلطیدہ است		پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است
مدعایش سلطنت بودے اگر		خود نکردے با چنیں ساماں سفر
دشمناں چوں ریگِ صحرا لا تعد		دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد
سرِ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بود		یعنی آں اجمال را تفصیل بود
تیغ بہرِ عزتِ دین است و بس		مقصدِ او حفظِ آئین است وبس
ما سوا اللہ را مسلماں بندہ نیست		پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست
خونِ او تفسیرِ ایں اسرار کرد		ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد
تیغِ لا چوں از میاں بیروں کشید		ازرگِ اربابِ باطل خوں کشید
نقشِ الا اللہ بر صحرا نوشت		سطر عنوانِ نجاتِ ما نوشت
رمزِ قرآں از حسینؑ آموختیم		زآتشِ او شعلہ ہا اندوختیم (17)

ترجمہ:

۱۔ موسیٰؑ اور فرعون، شبیرؑ اور یزید یہ دو قوتیں (خیر اور شر کی) زندگی سے ظاہر ہوئیں۔

۲۔ حق قوتِ شبیریؑ سے زندہ ہے، باطل کے نصیب میں آخر کار حسرت کی موت کا داغ ہے۔

۳۔ انھوں نے قیامت تک کے لیے استبداد کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔

۴۔ وہ حق کے لیے خاک و خون میں لوٹے ہیں تب لا الہٰ کی بنیاد بنے ہیں۔
۵۔ اگر ان کا مقصد سلطنت ہوتا تو وہ کبھی ایسے (معمولی) سامان کے ساتھ سفر نہ کرتے۔
۶۔ دشمن تو صحرا کی ریت کی طرح لاتعداد تھے اور ان کے ساتھی یزدان کے ہم عدد (۷۲) تھے۔
۷۔ وہ ابرہیمؑ اور اسماعیلؑ کا بھید تھے، یعنی وہ اس اجمال کی تفصیل تھے۔
۸۔ تلوار دین کی عزت کے لیے ہے اور بس اس کا مقصد شرع کی حفاظت ہے۔
۹۔ مسلمان اللہ کے سوا کسی کا غلام نہیں ہے۔ وہ کسی فرعون کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔
۱۰۔ ان (امام حسینؑ) کے خون نے اس حقیقت کی تفسیر کر دی۔ انھوں نے سوئی ہوئی ملت کو بیدار کر دیا۔
۱۱۔ جب انھوں نے لا کی تلوار نیام سے باہر کھینچی تو اربابِ باطل کی رگوں سے خون کھینچ لیا۔
۱۲۔ انھوں نے الا اللہ کا نقش صحرا پر کھینچا اور اس طرح ہماری نجات کے عنوان کی سطر لکھی۔
۱۳۔ قرآن کی رمز ہم نے امام حسینؑ سے سیکھی ہے۔ ان کی آگ سے ہم نے کئی شعلے حاصل کیے ہیں۔

علامہ اقبال کے نزدیک فرد اور جماعت کا تعلق لازم و ملزوم ہے۔ انسان کی انفرادی 'خودی' اس وقت تک کمال حاصل نہیں کر سکتی جب تک وہ 'بے خودی' کے ذریعے خود کو ملت کے نظریاتی سانچے میں نہ ڈھال لے۔ اطاعت اور ضبطِ نفس جیسے مراحل فرد کو نظم و ضبط کا پابند بنا کر معاشرے کے لیے مفید بناتے ہیں۔ تاریخی واقعات اور 'رموزِ بے خودی' کے اشعار ثابت کرتے ہیں کہ جب ایک فرد اپنی ذات کو قومی مفاد پر قربان کر دیتا ہے، تو اس کی انفرادیت فنا نہیں ہوتی بلکہ سمندر کی طرح وسعت اختیار کر لیتی ہے۔ اسلام کا نظامِ حریت، مساوات اور قربانیِ شبیری دراصل اجتماعی غیرت و حمیت کو بیدار کرنے کا ذریعہ ہے۔ پس، معاشرے کا حقیقی استحکام اور عروج صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب افرادِ ملت بے خودی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے عزم و عمل کو دین اور قوم کی بقا کے لیے وقف کر دیں۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، فروری، ۱۹۷۳ء، ص:۴۱
۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً، ص:۴۲
۴۔ ایضاً، ص:۴۳
۵۔ ایضاً
۶۔ ایضا
۷۔ ایضاً
۸۔ ایضاً
۹۔ ایضاً، ص:۴۴-۴۵
۱۰۔ ایضاً، ص:ص:۸۸

۱۱۔ جاوید اقبال، جسٹس، ڈاکٹر، (مرتب)، شذراتِ فکرِ اقبال، مترجمہ، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۳ء، ص: ۸۱-۸۲

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، ص: ۸۶

۱۴۔ عبد الحکیم، خلیفہ، ڈاکٹر، فکر اقبال، لاہور، بزمِ اقبال، نومبر، ۲۰۰۵ء، ص: ۴۷۶

۱۵۔ اقبال، کلیاتِ اقبال، فارسی، ص: ۱۰۶

۱۶۔ ایضاً، ص: ۱۰۷-۱۰۸

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۱۰-۱۱۱

References in Roman Script:

1. Iqbal, Kulliyat-e-Iqbal: Farsi, Lahore: Sheikh Ghulam Ali and Sons, February 1973, p. 41.
2. Ibid.
3. Ibid., p. 42.
4. Ibid., p. 43.
5. Ibid.
6. Ibid.
7. Ibid.
8. Ibid.
9. Ibid., p. 4–45.
10. Ibid., p. 88.
11. Javed Iqbal, Justice Dr. (Compiler), Shazarat-e-Fikr-e-Iqbal, translated by Dr. Iftikhar Ahmad Siddiqui, Lahore: Majlis-e-Taraqqi-e-Adab, 1983, p. 81–82.
12. Ibid.
13. Iqbal, Kulliyat-e-Iqbal: Farsi, p. 86.
14. Abdul Hakim, Khalifa Dr., Fikr-e-Iqbal, Lahore: Bazm-e-Iqbal, November 2005, p. 476.
15. Iqbal, Kulliyat-e-Iqbal: Farsi, p. 106.
16. Ibid., p. 107–108.
17. Ibid., p. 110–111.